Regd.L.No.7243 Phone: [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1978

اس پرچہ میں

۱ - فکرِ اقبال رح کا سرچشمہ ــ قرآن

۲ - اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

(یومِ اقبال رح پر محترم پرویز صاحب کا خطاب)

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ : ۲ روپے

تبویب القرآن

مجلد

ے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید نے
ا کہا ہے اور کہاں کہاں کہا ہے تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔
ں کتاب میں [illegible] قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن آیات کا حو
کیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے آپ اس کتاب
عت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ مفکرِ قرآن کی چالیس سال کی محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔
اب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر چھپی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھ
ن مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت مکمل سیٹ۔ ایک سو ساٹھ روپے بمعہ محصول [illegible]
چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اس لئے اس کی الگ الگ جلدیں
ہیں کی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ

ردین دانش چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ نمبر ۲ ل

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام (لاہور)

ٹیلی فون نمبر
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ـــــ ۲۴ روپے
غیر ممالک ـــــ ۳ پونڈ

قیمت فی پرچہ
۲
دو روپے

جلد ۳۱ | مئی ۱۹۷۸ء | شمارہ ۵

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ ـــــ قرآن ۵
(محترم پرویز صاحب)

۳۔ "اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" ۳۷
(یومِ اقبالؒ کی تقریب پر پرویز صاحب کا خصوصی درس)

۴۔ سود اور مضاربت ۵۷
(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

۵۔ معراجِ انسانیت ۔ مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں ۶۳

۶۔ درسِ قرآنِ مجید ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ استغاثہ کا وکیل کہتا ہے کہ ملزم نے فلاں قانون کی خلاف ورزی کی ہے اسلئے اسے سزا دی جائے۔ ملزم کا وکیل کہتا ہے کہ جس قانون کا حوالہ وکیلِ استغاثہ دے رہے ہیں، وہ قانون بالحق (VALID) نہیں۔ اس کی حیثیت ہی کچھ نہیں۔ عدالت کی طرف سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیسے؟ جواب دیا جاتا ہے کہ کسی قانون کے بالحق ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ مملکت کے آئین (کانسٹی ٹیوشن) کے مطابق ہو اور یہ قانون آئین کے مطابق نہیں۔ وکیلِ استغاثہ کہتا ہے کہ یہ قانون مجلسِ قانون ساز (لیجسلیٹو اسمبلی) کا باقاعدہ پاس کردہ ہے۔ جواب دیا جاتا ہے کہ مجلسِ قانون ساز کا پاس کردہ بھی وہی قانون بالحق قرار پا سکتا ہے جو آئین کے خلاف نہ ہو۔

عدالت، آئین کی متعلقہ شق دیکھنا چاہتی ہے۔ ملزم کا وکیل آئین کی کتاب کا متعلقہ صفحہ کھول کر پیش کر دیتا ہے۔ عدالت مطمئن ہو جاتی ہے کہ قانون واقعی (VALID) نہیں۔ اور مقدمہ خارج ہو جاتا ہے۔

لیکن آپ ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ کسی مملکت میں قانون سازی اور قانون کے بالحق ہونے کی بنیادی شرط تو یہ ہو کہ کوئی قانون آئین کے خلاف جائز نہیں قرار پا سکتا لیکن مملکت میں آئین کی کوئی کتاب ہی نہ ہو۔ سوچئے کہ ایسی صورت میں مجلسِ قانون ساز، قوانین وضع کس طرح کریگی اور عدالتیں اس کا فیصلہ کس طرح کرینگی کہ جو قانون ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ قانون ہے بھی یا نہیں؟ آپ بلا ساختہ پکار اٹھیں گے کہ کسی آئینی مملکت میں ایسی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو اس مملکت کی اساس اور بنیاد کے خلاف ہے۔

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ایسی صورت موجود ہے اور خود ہماری اپنی مملکت میں موجود ہے، اور اس کے یومِ اوّل سے آج تک موجود چلی آ رہی ہے۔ اس مملکت کے آئین میں یہ شق شامل تھی اور شامل ہے کہ (۱) مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور (۲) مملکت کا اوّلین فریضہ ہے کہ وہ موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق بنائے۔ اب ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے دو کتابوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک وہ کتاب جسے اللہ کی کتاب کہا جائے۔ یہ قرآن کریم ہے اور کتابی شکل میں ہر جگہ موجود ہے اور دوسری وہ کتاب جس میں ایسی سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو، جسے تمام مسلمان اسی طرح سنتِ رسول اللہ تسلیم کریں جس طرح وہ متفقہ طور پر قرآن مجید کو خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت اور شدید حیرت ہوگی کہ پاکستان میں ہی نہیں۔ تمام کرۂ ارض پر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر سنت رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔ اب آپ سوچئے کہ جب وہ کتاب ہی موجود نہ ہو جس نے اسلامی قوانین کی اساس و بنیاد قرار پانا تھا تو مملکت میں اسلامی قوانین وضع کس طرح ہو سکیں گے اور عدالتیں اس کا فیصلہ کس طرح کر سکیں گی کہ جس قانون کے مطابق انہوں نے پیش کردہ مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے، وہ قانون، بالحق یا جائز (VALID) ہے بھی یا نہیں۔ پاکستان کی گذشتہ تیس سالہ تاریخ میں اسلامی قوانین مرتب نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کوئی حکومت، اسلامی قوانین وضع اور نافذ کرنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی حکومت ایسا چاہتی تھی یا نہیں۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کوئی حکومت ہزار جان سے بھی چاہتی کہ ملک میں اسلامی قوانین وضع اور نافذ ہوں تو وہ بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جب وہ بنیاد ہی موجود نہ ہو جس پر اسلامی قوانین کی عمارت استوار ہونی تھی، تو وہ قوانین مرتب کیسے ہوتے؟ وہ بنیاد اب بھی موجود نہیں۔ مملکت میں اسلامی قوانین کا مطالبہ کرنے والوں (علماء کرام) کا فریضہ یہ تھا وہ ایسی کتاب مرتب کر دیتے جس میں درج شدہ سنت کو، تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے۔ جب وہ ایسی کتاب مرتب کر لیتے تو پھر حکومت سے مطالبہ کرتے کہ ملک کے موجودہ قوانین کو قرآن مجید اور اس کتاب کے مطابق تبدیل کیجئے اور آئندہ کوئی ایسا قانون وضع یا نافذ نہ ہو جو ان دونوں کتابوں کے مطابق نہ ہو۔ یہی دو کتابیں، مجلسِ قانون ساز کے لئے ضابطہ ہدایت قرار پاتیں اور یہی عدالتوں کے لئے قولِ فیصل۔ لیکن ان حضرات نے ایسا تو کیا نہ اور یہ ایجی ٹیشن برابر جاری رکھی کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جاتے۔

آپ دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ بات ایسی صاف اور واضح تھی تو پھر ان حضرات نے ایسا متفق علیہ مجموعہ مرتب کیوں کر دیا؟ یا اس لئے کہ یہ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسا مجموعہ نہ آج تک مرتب ہوا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔

یہاں پر آپ ہم سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرات ایسا کر ہی نہیں سکتے؟ آپ کا سوال بالکل بجا اور درست ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے۔ یہ حضرات اس کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ ملک میں اسلامی قوانین کا مطالبہ کرنے والوں میں مودودی صاحب پیش پیش ہیں۔ اور خود مودودی صاحب نے آج سے سات سال پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ:-

کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاء کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ۔ اہلِ حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ (ایشیا - ۲۳ اگست ۱۹۶۰ء)

اس پر آپ کے دل میں یقیناً یہ خیال ابھریگا کہ جب ان حضرات کو خود اس کا اعتراف ہے کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے مختلف فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں، تو پھر یہ حضرات اس کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟

آپ یہ سوال انہی سے پوچھئے۔ اور صرف انہی (یعنی علماء حضرات) ہی سے نہیں۔ ان دنوں اسلامی قوانین کی تدوین کے مسئلہ نے خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل، مرکزی حکومت کی مذہبی امور کی وزارت۔ اور وزارتِ قانون۔ بہت سے ماہرینِ قانون وغیرہ اس مسئلہ میں شدت سے دلچسپی لے رہے ہیں اور ملک کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو رہا ہے۔ لیکن نہ یہ حضرات کسی کو بتاتے ہیں، نہ کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ جب (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) ایسا ضابطہ مدون ہو ہی نہیں سکتا تو آپ جانتے بوجھتے اس سعی لاحاصل میں وقت اور توانائی کیوں ضائع کر رہے ہیں! اور آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ مودودی صاحب بھی ان سے ایسا نہیں کہتے۔ ایسا کہنا تو ایک طرف، وہ بھی اس مطالبہ کو دھرائے جاتے ہیں کہ ملک میں کتاب و سنت کے مطابق اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

ان حضرات کے ذمہ دار نمائندگان (ممتاز علماء) تو اسی میں خیریت سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ پر لب کشائی نہ کی جائے۔ چنانچہ وہ "کتاب و سنت" کے الفاظ تو دہراتے جاتے ہیں لیکن اس سوال کی طرف کبھی نہیں آتے کہ "سنت" کا کوئی ایسا مجموعہ موجود ہے یا مرتب کیا جا سکتا ہے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں یا کر لیں۔ ان میں سے کسی نے بھی مودودی صاحب کے مذکورہ بالا اعلان کی تردید نہیں کی۔ نہ ہی اس کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکتے ہیں بات بالکل واضح ہے۔ جب سنت کا ایسا مجموعہ مرتب نہیں کر سکتے جسے تمام فرقے متفق طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں تو ایسا ضابطہ مرتب کرنے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟

عام مولوی صاحبان یہ کہہ کر دفع الوقتی کر لیتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک کتاب نہیں، حدیث کی متعدد کتابیں ہیں جن میں سے کم از کم چھ (صحاح ستہ) ایسی ہیں جو سب کے نزدیک صحیح ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان (صحاح ستہ) کو بھی تمام فرقے صحیح ترین مجموعے نہیں مانتے۔ شیعہ حضرات کے حدیث کے اپنے مجموعے ہیں سنیوں میں سے اہلِ حدیث کے نزدیک بخاری اور مسلم کی ہر حدیث صحیح ہے اور ان میں سے ایک کا انکار بھی مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ حنفی حضرات ان مجموعوں کی قریب دو سو احادیث پر تنقید کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:-

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن - اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ تو رہا ان مجموعوں کا متفق علیہ ہونا، اب آگے بڑھئے ——— اہلِ حدیث حضرات احادیث ہی کو سنتِ رسول اللہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث اور سنت میں بنیادی فرق ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:-

سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی

زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت انسان ہونے کے ..... اختیار کئے ..... جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز منشا نہیں تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے"۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۳)

حدیث کے کسی مجموعہ میں اس کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ فلاں عمل حضورؐ نے بہ حیثیت رسالت کیا تھا اور فلاں انسان ہونے کی حیثیت سے۔ اس سے سوال پیدا ہوا کہ احادیث میں یہ فرق کیسے کیا جائے گا تو مودودی صاحب نے فرمایا کہ "ایسا فرق کرنا اسی طرح ممکن ہے کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ لہٰذا ان کے معیار کے مطابق سنت وہ ہے جسے دین کا مزاج سمجھنے والا سنت کہہ دے! اس وقت تک سنت کا ایسا مجموعہ کسی "دین کے مزاج سمجھنے والے" نے بھی مرتب کر کے نہیں دیا۔ ایسی کوشش کے متعلق جماعت اہلِ حدیث نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول اللہؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے"۔ ا؎

یہ ہے حقیقت اس "سنت" کی جسے کتاب کے ہمدوش اسلامی قوانین کی بنیاد اور اساس قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے کسی متفق علیہ مجموعہ کا موجود ہونا یا مرتب ہونا تو درکنار، اس کی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) بھی موجود نہیں۔ اس کیفیت کے پیش نظر، ہمیں اپنی مذہبی پیشوائیت پر تو حیرت نہیں ہوتی کیونکہ انہیں اپنی ہستی اور بقا کا راز ہی اسی میں دکھائی دیتا ہے کہ دین کے یہ اصول غیر متعین رہیں۔ ہمیں حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی آتا ہے ان حضرات پر جو یہ جانتے ہوئے کہ "سنت" کی کوئی کتاب (TEXT BOOK) ان کے پاس نہیں، کتاب و سنت کی بنیادوں پر اسلامی قوانین مرتب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور کوئی نہیں سوچتا کہ سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ سنت کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا یا کرایا جائے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں۔ لیکن ایسا کوئی نہیں سوچتا اور سب "پانی بلونے" کے جہاد میں مصروف ہیں۔ ان میں وزارتِ امورِ مذہبی۔ وزارتِ قانون۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین۔ اکثر و بیشتر جج صاحبان۔ وکلا حضرات سب شامل ہیں۔ اگر یہ معاملہ محض "کاروباری" ہوتا تو ہم پھر بھی اسے اتنی اہمیت نہ دیتے ـــــ اگرچہ کاروباری معاملہ میں بھی اس قسم کی ذہنیت چنداں مستحسن قرار نہیں پاتی لیکن یہ مسئلہ کا تو تعلق دین کی اصل و اساس، مملکتِ پاکستان کے مستقبل اور خود اسلام کے رد و قبول سے ہے۔ ہمارے بیان کی رو سے تو اس کا مواخذہ عدالتِ خداوندی میں بھی ہوگا۔ ہمیں ان میں سے بعض حضرات سے گفتگو کا موقعہ ملا ہے۔ وہ ان سب باتوں سے متفق ہوتے ہیں جو اوپر کہی گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن ان مسائل کو چھیڑ کر کون بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے! انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اے کاش! ایسا کہتے وقت انہیں خدا کی اس تہدید و تنذیر کا کچھ خیال آ جاتا جس میں اس نے کہا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۔ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ...... (۵/۵۴)

اے ایمان کے مدعیو! جو کوئی تم میں سے دینِ خداوندی سے پھر جائے گا تو اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو خدا (کے دین) کو سب سے زیادہ عزیز رکھیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا انہیں بھی عزیز رکھے گا۔ وہ مومنین کے سامنے جھکے ہوں گے اور مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت۔ وہ خدا کی راہ میں مسلسل جہاد کرتے رہیں گے ـــــ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

اس آیۂ جلیلہ سے واضح ہے کہ (۱) ملامت کرنے والوں کی ملامت سے ڈر کر حق بات زبان پر نہ لانا دین سے ارتداد ہے۔ (۲) اگر ایسی قوم اپنی روش کو نہ بدلے تو اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے۔ اور (۳) اس نئی قوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی کی طرف سے ملامت کا خوف اسے حق بات کہنے اور اسے نافذ کرنے سے باز نہیں رکھتا ـــــ پاکستان شاید کسی ایسی ہی قوم کے انتظار میں ہے کہ ـــــ عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد ہے۔

ا؎ حدیث اور سنت کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے۔ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۵ء۔

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یومِ اقبالؒ —— ۲۱؍اپریل ۱۹۷۸ء

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ —— قرآن

پرویزؔ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ ـــــ قرآن

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں کہئے گویا اپنی زندگی کے آخری سانس میں) کہا کہ:-

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک ۔۔۔ ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر ۔۔۔ چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود
(ارمغانِ حجاز۔ صفحہ ۱۹۹)

اُس وقت تو اسے عام طور پر شاعرانہ تعلّی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور گزرتا جا رہا ہے، یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی۔ ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بصد درد و سوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں ـــــ گزشتہ قریب چالیس سال کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیئے، ۱۹۷۷ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا، ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا، وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بمشکل سما سکے گا۔ لیکن اربابِ فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ، اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی بر حقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا ـــــ اس کے ڈانڈے کہیں "مغرب کے سیاروں" سے ملائے گئے، کہیں "مشرق کے ثوابت" سے ـــــ لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی

اقبالؒ کی اوّلیں دعا

سب سے پہلی تصنیف ـــــ مثنوی اسرار و رموز ـــــ میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں، "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے زیرِ عنوان کہا تھا:-

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن — بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من — زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بددعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بددعا، اقبالؒ اپنے حق میں کر نہیں سکتا تھا۔ (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بددعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی، اور ان الفاظ کو وہ زبان تک کیسے لے آئے!) کہ :-

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

"بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا" کی دردانگیزی اور جگر گدازی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اقبالؒ کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبالؒ کا، بحضور رحمۃ للعالمینؐ یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے، اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیرِ قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ——— بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ :-

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایکہ از احسانِ تو ناکس کس است — یک دعا ایں مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل — عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ — بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا — (رموز و اسرار، صفحہ ۹۶-۱۹۵)

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام، آبِ حیات
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام — (مسافر، صفحہ ۴۳)

وہ، ارمغانِ حجاز میں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ :-

بگو از من نوا خوانِ عرب را — بہائے کم نہادم لعلِ لب را
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم — سحر کردم صد و سی سالہ شب را — (صفحہ ۱۱۴)

جاوید نامہ میں "نوائے سروش" کے زیرِ عنوان، کہتے ہیں :-

چوں سرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم — تقدیرِ امم دیدم، پنہاں بکتاب اندر — (صفحہ ۴۳)

اقبالؒ کے ہاں، کتاب سے مراد، کتابِ خداوندی قرآنِ مجید ہی ہوتی ہے۔ بالِ جبریل میں کہتے ہیں :-

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (صـ۴۷)

وہ بصد حسرت کہتے ہیں کہ:

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب — شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (جاوید نامہ صـ۵۶)

وہ انقلابِ روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ:

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جُستۂ او را اساسِ محکمے؟

اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ:

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (جاوید نامہ صـ۵۸)

عظیم تحفہ ان کی نگاہوں میں قرآن کریم کی عظمت کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب وہ شاہِ افغانستان نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے، تو ان کے لئے ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں:

در حضورِ آں مسلمانِ کریم! — ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است — در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است

اس کے جواب میں شاہِ مرحوم نے کہا:

گفت "نادر" در جہاں بیچارہ بود — از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر — از غمانِ بے حسابم بے خبر
غیرِ قرآں غم گسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب را بر من کشود"
(مسافر صـ۱۴-۱۵)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازمِ لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رُکے۔ اہلِ دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپاسنامے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد، دہلی کے امام، شمس العلماء مولانا سید احمد (مرحوم) کے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا:

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآنِ پاک) ہے جس کی روشنی میں میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ (گفتارِ اقبالؒ، از محمد رفیق افضل۔ صـ۱۳۶)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے۔ (اقبالؒ نامہ۔ حصہ اول۔ صـ۱۳۰)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآن کریم بتاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس حقیقت

کو ایسے واضح انداز سے واشگاف کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے اور اس جہت سے قرآن کریم کے مفہوم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور سہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق خود حضرتِ علامہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بعض مقامات پر، ان کی فکرِ قرآن سے میں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف کریں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہی قرار دیا ہے، اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ہماری حرماں نصیبی ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب علاج کی غرض سے، بھوپال تشریف لے گئے ہیں، تو انہوں نے (۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیر (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

> اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ، جب ان کو سرِ راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی ٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کرونگا۔
>
> (انوارِ اقبالؒ۔ بشیر احمد ڈار۔ صـ۲۰۵)

قوم کی بدقسمتی کہ ان کی صحت نے اس کی اجازت ہی نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکتے۔ اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاعِ گراں بہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے زبانِ شعر میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آ سکتے۔ دوسرے، شاعری میں تضاد بھی واقعہ ہو جاتا ہے۔ لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآنی حقائق، مربوط شکل میں، بلا تضاد، نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جا سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ:-

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر — اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر (بانگِ درا)

اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے علاج اور سفر یورپ کے لئے مہیا کر دیتی تو نہ معلوم وہ کس قدر گہرہائے تابدار سے اس کی جھولیاں بھر دیتے۔ انہوں نے سچ کہا تھا کہ:-

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل۔ صـ۱۹)

بہرحال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبالؒ کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآنِ مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآنِ پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآنِ پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا۔ اور اس سے وہ خود بھی کیف یاب و سرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں، ان کا گلا (قریب قریب) بند ہو گیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا۔ اور وہ یہ کہ :-

در نفس سوزِ جگر باقی نماند　　لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد .... صفحہ ۶۸)

لیکن ان کی یہ "تلاوت" لفظی طوطا خوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و غوامضِ قرآن کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوا یوں کہ انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے "اقبال ڈے" کی تقریب میں شرکت کے لئے "اقبالیین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم جیراج پوریؒ لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ، شیخ سراج الحق صاحب، اسد ملتانی (مرحوم) اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ جنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ محترمی سید نذیر نیازی نے اس کی روئداد، اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے :-

> (حضرت علامہ نے فرمایا) - میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآن پاک .... کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا، کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسبِ معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور

اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب ؐ کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے، تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ (اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہؒ کے والد ماجد نے فرمایا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ کامل ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآنِ مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پہ اس کا نزول ہو۔ (ص۶۱-۶۰)

مطلب یہ تھا کہ قرآنِ مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منتہیٰ کو دل کی گہرائیوں میں پیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقعہ ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے، یہ دیکھنا چاہئیے کہ وہ حضور نبی اکرم ؐ کے اسوۂ حسنہ کے کس حد تک مطابق ہے۔ قرآن فہمی کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ:

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود   (جاوید نامہ صفحہ ۹)

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے "نزولِ کتاب" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف   (بالِ جبریل ص۱۱۲)

دوسری جگہ کہا ہے:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل   دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلبِ نبوتؐ قرار دیا ہے، جہاں فرمایا کہ: فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ۔ (۲/۹۷) "جبریل نے اسے تیرے قلب پہ نازل کیا" لہٰذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ قرآن گویا اس پہ نازل ہو رہا ہے ——— یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اتر رہا ہے۔ اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ "مردِ مسلمان" ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن   قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(ضربِ کلیم۔ ص۵۸)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے مختص تھی اور اس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہم کلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے جہاں کہا ہے۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (۴/۱۶۴) اور اس نے قرآن مجید کو بھی کَلَامُ اللّٰهِ (۹/۶) کہا ہے۔ اب

خدا سے ہم کلامی

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآن مجید میں) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (بلکہ) يٰاَيُّهَا النَّاسُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے ہم کلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف، انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ (قرآن کریم کے ذریعے) اسے اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا، قرآن کے ذریعے، انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختم نبوت کے بعد خدا، انسان سے صرف قرآن کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے سوا، خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہر حال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے راستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتے۔ بایں ہمہ انہیں کشف و الہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانین خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کارفرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے اس لئے اسے قرآنی شواہد سے آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی۔ اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے   حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

یہاں انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ (یعنی فکر و شعور)۔ کشف و الہام یا علمِ باطنی نہیں کہا۔

قرآن کا تعارف

اب یہ دیکھئے کہ حضرت علامہ، قرآن مجید کا تعارف کس کس انداز سے کراتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے ادنیٰ تعمق پر حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگہِ فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمود میکانکی طور پر ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر ہائے آبدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجد آفرینی و قلوب فراواں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف — "اسرار و رموز" — میں کہتے ہیں ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟   زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او   در فتد با سنگ جام از زورِ او
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ! (۱۴۲)

قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خستہ باشی استوارت می کند   پختہ مثلِ کوہسارت می کند

گر زمینی ! آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا" ـــــ اس ایجاز میں جس قدر اطناب پوشیدہ ہیں، ان کا اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اثمار و نتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جا سکے۔ اس میں مشیتِ خداوندی کے مقصود و مطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے ـــــ آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا ـــــ

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

"اسرار و رموز" ہی میں دوسری جگہ کہے ہیں :-

قلبِ مومن را کتابش قوت است حکمتش حبل الورید ملت است (ص ۱۱۷)

قرآن، انفرادی طور پر کس قسم کی قلبِ ماہیت پیدا کرتا ہے، اور امت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر محکمیت کا ضامن بنتا ہے، اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں۔

وہ، مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیامِ لا تخف می رساند بر مقامِ لا تخف (ص ۳۳)

حضرات انبیاء کرام، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف، مفاد پرست قوتیں ہجوم کر کے امڈ آتی تھیں۔ ان کے ساتھ تزاحم و تخاصم کی ہنگامہ آرائیاں بڑی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں۔ ان مقامات پر انہیں خدا کی طرف سے سکینت و طمانیت قلب کے اس قسم کے پیغامات موجبِ حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ : لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى۔ (۲۰/۶۸) "تم خوف زدہ مت ہو، آخر الامر تم ہی غالب آؤ گے"۔ کم و بیش یہی الفاظ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں۔ ان سے کہا ہے کہ ہجومِ مشکلات سے گھبراؤ نہیں، لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۱۳۹) "جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کونسی بات ہے۔ تم ثابت قدم رہو۔ آخر الامر تمہیں غالب آؤ گے"۔

قرآن کی عظمت

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت و عظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

قرآن مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلم بند کی جائیں، تو جو بات "چیزے دیگر است" میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلدات میں بھی سما نہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق و رموز کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردمِ دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسرو نے اپنے محبوب کے متعلق کہا تھا کہ :-

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام ! بسیار خوباں دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

اقبالؒ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے اور کیا ہے ؛ اس شعر کو پھر پڑھئے کیونکہ

اس کا مفہوم اُس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے :

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود (ص ۹)

"جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود"۔ قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفۂ حیات و لائحۂ انقلاب کی تفسیر ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱) یاد رکھو! (تم خود تو کجا) خدا بھی کسی قوم کے احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ——— انقلاب نہ پیدا کر لے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ، اس کی فکر و نظر، اس کے تصورات و تخیلات، اس کی اقدارِ حیات، اس کے نصب العین زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے میں ڈھلتی ہے جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔" بنا بریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آ جاتا ہے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اندرو تقدیرہائے غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق (ص ۹۱)

قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعتِ اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ :

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست

چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش (ص ۷۲-۷۳)

ان آیات میں، جس حسن کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے، جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے، نوعِ انسان کو منزلِ انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہ نمائی اپنے ذمہ لی اور اس کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوعِ انسان عالمِ طفولیت میں تھی تو اس پروگرام کی صورت یہ تھی کہ اس میں

آسمانی ہدایت کی ابدیت

اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ ——— اس زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوعِ انسان عمر میں بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہونا شروع ..... ہوا تو اس پروگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ جب وہ عالمِ شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی راہ نمائی کے لئے ضرورت تھی مکمل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیا، اور سلسلۂ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں غور کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتابِ ہدیٰ قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) "ہم" انہیں (نوعِ انسان کو) خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی "نشانیاں" دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے" یعنی جوں جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے جن حقائق کا ادراک ہو، انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہونگے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ عالمِ انفس و آفاق میں کوئی حقیقت بے نقاب ہو، اور وہ قرآن کے خلاف جائے۔ ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ:-

> قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزءً کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی، باہم فراہم کر لے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآنِ پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا:-

> حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآنِ مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں۔ اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن کی۔ حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک

ہے، مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہٰذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہو گا
اس کی تعلیم سے بہرہ در ہونا ہو گا۔ (اقبالؒ کے حضور۔ صفحہ ۵۶-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان عمیق الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یاز نورِ مصطفےٰ اورا بہا ست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

یہ نورِ مصطفےٰ وہی ہے جو حضورؐ نبی اکرم کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب قندیلِ قرآنی میں محفوظ ہے۔ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ۔ (۲۴/۳۵)۔

ان تشریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا، جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ:

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
چوں کہن گردد جہانے در برش　　می دھد قرآں جہانے دیگرش

اس طرح قرآن کے اصول و حقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے، اور انسانی کی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروانِ انسانیت کے راہ نما بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہ نمائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوئٹے نے، ایکرمن کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ:

اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
(خطباتِ اقبالؒ۔ صفحہ ۳)

یہ ہے قرآن کی ابدیت!

قرآنی انقلاب

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصولِ حیات سے نوعِ انسان کو حاصل کیا ہوا؛ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہو گا۔ اس اہم سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے جہاں کہا کہ:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ　　(جاوید نامہ۔ صفحہ ۸۹)

"خواجہ را پیغامِ مرگ" کا مطلب یہ ہے قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔
اسی حقیقت کو انہوں نے، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں، ابلیس کی زبان سے ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
(ارمغانِ حجاز۔ صفحہ ۲۲۵)

اب آگے بڑھیئے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جس قدر قوت و حشمت۔ دولت و ثروت۔ شوکت و مملکت۔ رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ، شرف و مجدِ انسانیت کے مقاماتِ بلند حاصل کئے تو وہ سب اتباعِ قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر "عجمی اسلام" اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہوگئی جس کا ہم سب رونا روتے ہیں۔ اقبالؒ کو امتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع

اُمّت کی تاریخ

پر اس قدر شدت و تکرار سے لکھا ہے کہ اس سے ایک مستقل تصنیف وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن مَیں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ:۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ ص ۹)

اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنیئے۔ پہلے اس حقیقت کو بصد حسرت پیش کرتے ہیں کہ:۔

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلماں دیگر است!
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقامِ حیرت و تاسف ہے کہ:۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر (جاوید نامہ ص ۸۳)

اس قوم میں اس محیر العقول تبدیلی کا راز، اس ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ خلافت نے انہیں، ہر نوع غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی، ملوکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا:۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز ص ۱۲۷)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق مومن و غداری و فقر و نفاق!
با پشیزے دین و ملت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت
لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ او نماند جلوۂ در کائناتِ او نماند
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!
ہر کسے بر جادۂ خود تند رو ناقہ ما بے زمام و ہرزہ دو

واحسرتا کہ :

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب العجب ۔ ثم العجب ۔ ثم العجب !

(جاوید نامہ ۔ صفحہ ۲۳۵-۳۶)

وہ کہتے ہیں کہ سوچئے کہ یہ بات کس قدر ناقابلِ فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتاب زندہ موجود ہو، وہ قوم مردہ ہو! وہ بصد حیرت کہتے ہیں کہ :

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد ؟ (جاوید نامہ صفحہ ۲۴۰)

وہ مسلمان سے کہتے ہیں :

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز ! (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۰۱)

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا اور دل خراش حقیقت سامنے آئی ۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر، (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام تگ و تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا ۔ اس کے مقابلے میں، قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیرباد کہتے چلے جاتے تھے ۔ کہیں ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نما لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے ۔ کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خان جیسے ماہرینِ تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر " واردھا کی تعلیمی اسکیم " مرتب فرما رہے تھے ۔ کہیں (امام الہند، مولانا) ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمو سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے ۔ کہیں (شیخ الحدیث، مولانا) حسین احمد مدنی جیسے علماء کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو عین مطابقِ اسلام قرار دے رہے تھے ۔ یہ تھی وہ سینہ سوز حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے بصد نالہ و فغاں کہا تھا کہ :

درِ صد فتنہ را بر خود گشادی دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست تو قرآں را سرِ طاقے نہادی (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۳۶)

اور یہ کہ :

نگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بکس اسرارِ خود را !
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوشِ خود برد زنارِ خود را (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۳۷)

مُلّا اور قرآن

میرے نزدیک حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بکمالِ جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشت از بام کیا کہ اُمت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ مُلّا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں ۔ انہوں نے مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص مُلّا یا طبقۂ علماء کے خلاف نہیں ۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی (INSTITUTION) کے خلاف ہے ۔ جس نے اسلام کو کچھ کا کچھ بنا دیا اور اُمت کو تباہ کر دیا ہے ۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں ۔ اس وقت میں اس کے ان چند ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا جن کا تعلق براہِ راست

قرآن سے ہے۔ وہ جاویدنامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں :-

دینِ حق از کافری رسواتر است | زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش | دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانہ | نزدِ او ام الکتاب افسانہ!
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ | آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد | ملت از قال و اقولش فرد فرد!

حد یہ کہ :-

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب | کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد! (جاوید نامہ۔ ص۸۴)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں :-

مکتب و مُلّا سخنہا ساختند | مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود، از تاویل مُرد | آتشِ او در ضمیرِ او فسرد
ہر یکے دانائے قرآن و خبر | در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس | منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس
ایں کلیاں نیست امید کشود | آستیں اے یدِ بیضا چہ سُود (ص۴۲-۴۱)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں :-

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے | کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیل و مصطفےؐ را (ارمغانِ حجاز ص۱۰۱)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں | ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (ص۱۳)

ان کی ان تاویلات و تغیرات کا نتیجہ ہے کہ :-

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم | جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیں
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز | تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا | کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (ضربِ کلیم ص۸)

پیغام بہ ملت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تار و پود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمانوں سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ :-

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآن کریم نے، کتاب و حکمت ـــــ یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزل من اللہ بتایا ہے جو علم و عقل کی رو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافر میں کہا ہے :؎

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق — ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال — مومناں را آں جمال است ایں جلال

اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں :؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لاتخف — می رساند بر مقامِ لاتخف (مسافر۔ ص۴۳)

وہ خصوصیت سے مغرب زدہ[۱] مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو — دامنِ قرآں بگیر، آزاد شو (جاوید نامہ۔ ص۸)

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبالؒ میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ بہ نظرِ ظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ ـــــ محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ "اسلام" ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ)۔ ملوکیت سے یہ دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو (مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ۔ گیان دھیان۔ بھگتی اور پرستش کی رو سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے پہچاننے اور ماپنے کا کوئی خارجی اور محسوس معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس، دین اس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں احکام و اصول و اقدارِ

دین و مذہب

قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جا سکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ (۲۴/۵۵) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کتاب کے ساتھ حدید (فولاد یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا

۱؎ "اقبالؒ اور تہذیبِ مغرب" الگ موضوع ہے جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

بِالْبَيِّنٰتِ - " ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا۔ یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ، علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کرلیں، انہیں ضابطہ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ - " اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطہ قوانین) بھی نازل کی " اس سے مقصد کیا تھا؟ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو ازروئے عدل و انصاف طے کیا جائے لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہوگا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا: وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ...... (۵۷/۲۵) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر) بھی نازل کی۔

قرآن اور شمشیر

اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی۔ اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے، اور مظلوم کی داد رسی ہوتی ہے جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ اسلامؐ مذہب نہیں دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصور اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں ـــــ قوانین اور قوتِ نافذہ۔ جہاں تک قوت کا تعلق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جاسکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ تیغ (قوت) کو بے باک نہ ہونے دے۔ اسے حدودِ خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیمؒ کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی " قوت اور دین " ہے، ان کے اس پیغام کی مظہر ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں | سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے | صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک (ص۲۲)

دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے، کہتے ہیں کہ: ؎

اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں | پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار (ص۲۱)

ان کے اس مشہور شعر: ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو | جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(بالِ جبریل - ص۶۲)

ہیں، سیاست سے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا قرآنی اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں' (محترمہ خاتون)... شرف النساء کی زبان سے' جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے' اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شرف النساء' قرآنِ پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو ؎

برلبِ اوچوں دمِ آخر رسید | سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر | سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند | کائناتِ زندگی را محور اند!
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن | تیغ و قرآں را جدا از من مکن

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۱۸۲-۸۳)

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ ؎

حکمرانے بود و ساماںے نداشت | دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت (صفحہ ۵)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملک مظفر کے قصہ کے ضمن میں کہا ہے کہ ؎

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس | چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (صفحہ ۲۴۰)

میں اسے دہرا دوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ "ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند" اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے!۔ تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن' تلوار کی۔

اور اب ہم سورۂ حدید کی متعلقہ آیت ($\frac{۵۷}{۲۵}$) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب۔ (ضابطۂ قوانین) —

قانون سازی

علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے میں کونسی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں ——— اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطۂ قوانینِ شریعت اپنا اپنا اور الگ الگ ہے، اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف، اس میں ذرا سے ردّ و بدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلّمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت

دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت خود مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اول اس لئے کہ قرآن کی رو سے، پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک، اسلامی حکومت اس کی مجاز ہی نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین) مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اس سوال پر، تصورِ پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر و تدبر کا مرکز تھا۔ (مثلاً) امرتسر میں اہل قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرتِ علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں علامہؒ نے صوفی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا:-

> مجھ کو اُن کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدؐیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں، جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعث برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ ... "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور

اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے، مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں علماء حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ صفحہ ۴۸-۵۱)

اس خط میں علاوہ دیگر امور کے یہ الفاظ کہ "جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو" حضرت علامہؒ کے مرکزی فکر کی بین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے:۔

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا: "مفصل کہو"۔ میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خدائے تعالےٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں[1]

(ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی۔ صفحہ ۴۵-۴۶)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشی صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے آمدِ حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمدِ ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا۔ "میرا یہ اعتقاد نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا "کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے؟"۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

آپ نے فرمایا: "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ (یہ کن) ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔" (ملفوظات۔ ص ۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔" (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۱۳۵)

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں جستہ جستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں۔ لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطباتِ تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال و تمام آپ حضرات کے سامنے آجائے۔ بنا بریں، میں اس خطبہ کے متعلقہ مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول و اقدار عطا کئے ہیں اور اسے امتِ مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور

ثبات و تغیّر کا امتزاج

ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ---- وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے

مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطّل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔

ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:-

> رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (ارلجہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں ..... آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی

کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا کہ:۔

> تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

> اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔

اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:-

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ:-

بایں ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرن اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں:-

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو)۔ انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب

ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا، جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورؐ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعۂ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکمِ خداوندی تھا کہ:-

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ:-

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصوّر خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصوّر امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ـــــــ اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔ اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ـــــــ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دَور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعمیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:-

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ائمہ ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

ان تصریحات سے ـــــــ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:-

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے

آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔

رُوحِ عمری رضؓ

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا:-

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے، اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔

(بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری۔ فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہؒ ہم میں موجود ہوتے تو وہ اپنی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کرا دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بننا چاہتی خضرِ راہ ثابت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑ بندیوں سے آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی ہے۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آرہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابلِ صد رشک و موجبِ ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثمار کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ یہ تھی علامہ اقبالؒ کی آرزو، اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ لیکن اس تیس سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابلِ عمل نظامِ مملکت وجود میں آجاتا لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطاب میں دیا ہے جس کا عنوان ہے ——— "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"؟ ——— اس مقام پر میں صرف حضرت علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ "تمام نوعِ انسان کے لئے" اور "ابدی طور پر" کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۳۸/۸۷) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ ہدایت۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴/۲۴-۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے۔ حضرت علامہؒ کے الفاظ میں:[1]

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ (ضربِ کلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا کرنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگچی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس خاصیت کو کھو نہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمر خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآنِ مجید ایک عالمگیر ضابطۂ ہدایت ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملّت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے

---

[1] یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

چاہتے تھے کہ اس شجرِ طیب کے حیات آور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہر چند یہ اُمت، نکبت و زبوں حالی کا شکار ہے۔ اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوستہ رہنا ضروری ہے۔ بانگِ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ: ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور — خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے!
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا۔ صفحہ ۲۸۰)

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ: ؎

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی! — چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اس زوال پذیر اُمت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کی نشاۃِ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا صحن ہو۔ لیکن اس کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی یہ تنذیر بھی ان کے سامنے تھی جس میں کہا گیا ہے کہ: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۸) "اگر تم نے اس (قرآن) سے اعراض برتا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔" وہ، اپنی قوم کے لئے دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی جذباتِ محبت، اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیدۂ پرنم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحت نیوش کے ساتھ سنئے۔ فرماتے ہیں: ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا ست — احتیاجِ روم و شام او را کجا ست
حق اگر از پیشِ ما برداردش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۲-۹۱)

پیامِ اقبالؒ

عزیزانِ من! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلام و پیامِ اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العینِ حیات تھا۔ اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا۔ بلا شائبۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ :-

ازتب و تابم نصیبِ خود بگیر　　بعد ازیں نایدچو من مردِ فقیر

اس لئے کہ :-

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام　　کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سراغ　　عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت!　　با مسلماں حرفِ پرسوزے کہ گفت؟
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت　　تا مقامِ خویش بر من فاش گشت
حرفِ شوق آموختم وا سوختم　　آتشِ افسردہ باز افروختم
با من آہِ صبح گاہے دادہ اند　　سطوتِ کوہے، بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ　　در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست　　جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغ بے نیام

(مسافر - صفحہ ۴۴-۳۴)

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیامِ حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ——— اے خنک مردے کہ در عصرِ من است ——— (مسافر صفحہ ۳۲) ——— اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریدہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس نوائے حیات آور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری کر دیں۔

"ڈھولک والوں" سے آگے بڑھ کر ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے، علامہ اقبالؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا، وہ "شاعرِ مشرق" کا تھا۔ اس خطاب کا اس شد و مد سے چرچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصلِ فکر کا اظہار نثر میں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں کھڑا کرتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے)

میں شاعر نہیں!

رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے ستائش گر انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ نہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعہ نظم (پیام مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ :-

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ۔۔۔ از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہِ خسروی او را دھم ۔۔۔ تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

او حدیثِ دلبری خواہد ز من ۔۔۔ رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید

آشکارم دید و پنہانم ندید (پیام مشرق صـ۳)

اقبالؒ کے نام لیوا بالعموم اس کے "آشکار" کے گرویدہ رہے۔ اس کے "پنہاں" تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے "پنہاں" تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ :-

پردۂ تو از نوائے شاعری است ۔۔۔ آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

(غنی کاشمیری۔ در۔ جاوید نامہ صـ۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا :-

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصوّر کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ــــ ہاں ــــ بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ (مکتوبات۔ حصہ اوّل۔ صـ۱۹۵)

دیکھئے! وہ انہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ عجم میں ہے :-

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم ۔۔۔ مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست ۔۔۔ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست (صـ۲۰۴)

اور جب یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ :-

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند ۔۔۔ ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند

من اے میرِ اممؐ! داد از تو خواہم ۔۔۔ مرا یاراں غزل خوانے شمردند (ارمغانِ حجاز صـ۵۹)

اور اس کے بعد کہتے ہیں :-

نہ شعر است اینکہ بروے دل نہادم ۔۔۔ گرہ از رشتۂ معنی کشادم

بامیدے کہ اکسیرے زند عشق ۔۔۔ مسِ ایں مفلساں را تاب دادم (صـ۵۸)

اور پھر یہ فریاد کہ :-

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے ۔۔۔ بگوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوے

ولے گویند ایں حق نا شناساں   کہ تاریخ وفات ایں داں گو ئے   (صفحہ ۵)

وہ گفتنۂ اقبالؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است   ایں کتاب از آسمانے دیگر است۔   (جاوید نامہ صفحہ ۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا وہ "از جہانِ دیگر" تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو جو بطور ذریعۂ ابلاغ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائج مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور الٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری "ڈھولک" سے الگ رہ نہیں سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہ نے (ابلیس کی زبان سے) کہلوایا ہے کہ :-

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی   ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام   (ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۱۶)

اس کے باوجود، پیغامِ اقبالؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمہ، قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا، تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہا ہے) جہانِ ابلیس۔ یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لئے پیغامِ موت ہو گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ——— پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اوّلیں آماجگاہ بنتا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبالؒ کے پیغام کا اوّلیں مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھا چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا انتظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بیشک لیا جائے لیکن اس کا پیغام، عام نہ ہونے پائے۔ اور چونکہ اقبالؒ بھی قرآن کا پیغام بر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبالؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبالؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔ قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے مرکز سے اٹھتی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور بے دینی کے مرادف قرار پا گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبالؒ کو عام کئے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بنا پر یہ فیصلہ کیوں کر لوں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبالؒ ہی نے کہا تھا کہ :-

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو است   زندگانی محکم از لا تقنطوا است
تا امید از آرزوئے پیہم است   ناامیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود   ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی   خشک گردد چشمہ ہائے زندگی   (اسرار و رموز صفحہ ۱۰۸)

قرآن کی یہی تشدید جانفزا ہے جو اس طول طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی، اور قدم قدم پہ یہ کہہ کر میرا حوصلہ جوان کر دیتی ہے کہ :-

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار   ہر زماں پیشِ نظر، لا یخلف المیعاد دار

والسلام

باسمہ تعالیٰ

بیادِ اقبالؒ

اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

یومِ اقبالؒ پر

پرویز صاحب کا خطاب

جسے بعد نظرِ ثانی دوبارہ شائع کیا جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر غور کیجئے، جس زمانہ میں، جس ملک میں، اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی جھلک نظر آئے گی، تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فساد انگیزی کے عوامل و عناصر تین ہی ہوں گے ـــــ یعنی ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ـــــ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ عناصر اپنا پیکر بدلتے رہیں گے۔ لیکن روحِ ہر زمان اور ہر مکان میں وہی کارفرما ہوگی۔ اگر آپ قرآنِ کریم پر نگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت، انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، نعرۂ انقلاب تھی۔ وہ انسانوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو اُلٹ دیا جائے۔ انبیائے گذشتہ کے کوائف اور امم سابقہ کی داستانیں، جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ اسی کش مکش کی سرگذشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفاصیل ہیں۔ ان داستانوں میں، قصۂ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کش مکش میں فسادِ آدمیت کے یہ تینوں گوشے یکجا سامنے آگئے تھے۔ یعنی فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، مذہبی پیشوائیت کی روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون، سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ ـــــ یہ تینوں یکجا، اور ان کے پنجۂ فولادی کی گرفت میں تڑپتی، پھڑکتی قوم بنی اسرائیل جس کی رستگاری کے لئے ایک چھوڑ، دو دو اولوالعزم پیغمبر (صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسےٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) نبرد آزما ـــــ اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادیٔ سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیبؑ ان کے مددگار۔

یہ کش مکشِ حق و باطل، یہ چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری، اسی طرح مسلسل چلی آرہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، خدا کی آخری کتاب ـــــ قرآنِ کریم ـــــ اور اس کا آخری رسول ـــــ

انقلابِ عظیم

ـــــ نبی اکرمؐ ـــــ نوعِ انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات دلانے کے لئے آئے۔ قرآنِ کریم نے حضورؐ نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) وہ اُن زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ اور ان بوجھل سلوں کو اس کے سر سے اتار دے گا جن کے نیچے وہ کچلی جارہی تھی ـــــ نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال انقلابی جدوجہد سے، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت،

اور نظامِ سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اور اس طرح خدا کی مخلوق دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئی ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دورِ حریت و آزادی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ا؎ "مژگانِ عقیدت" سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ؑ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ ؎

حیرت انگیز رجعت

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر قرآنی زندگی کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک "قفس حلال اور آشیانہ حرام" ہے۔ اس کے اسباب و علل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس خلافِ اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں "شرعی سندات" مہیا کر دیں ——— اربابِ حکومت ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر، انہیں "ظل اللہ علی الارض" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی مل بھگت تھی جسے قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دوران میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا، بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن و تشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر امید کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں اُمت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و مُلّا و پیر

اور اس نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا کہ :-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

میں آج کی نشست میں، مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا کہ قرآن کریم

ا؎ اس کے لئے دیکھئے میری کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" کا آخری باب۔

نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں —— ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری —— کے متعلق کیا کہا ہے اور اقبالؒ نے اپنے حسین دبلیغ انداز میں اس کی کس طرح تشریح کی ہے۔

ملوکیّت

ہمارے ہاں، ملوکیت سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق بھی، ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (MONARCHY) یا شخصی اقتدار (AUTOCRACY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (DICTATORSHIP) سے آگے بڑھیئے تو اگر کسی ملک پر اُس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اُسے محکومی کہا جاتا ہے۔ آزادی اور محکومی کا یہ تصور تو دنیا میں ابتک موجود ہے لیکن انقلابِ فرانس نے، ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیما کریسی کہہ کر پکارا گیا۔ لفظی طور پر تو اس سے مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت، لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگانِ قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت جسے اکثریت حاصل ہو۔ یعنی اس میں اقتدارِ مملکت، ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دو سو سال کے تجربہ نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست و عمرانیت کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس کے ہاتھوں تنگ آچکے ہیں۔ میں اس وقت اس کی ایک عملی مثال پر اکتفا کروں گا۔ ایک حلقۂ نیابت میں ووٹ قاعدے اور قانون کے مطابق صحیح صحیح بنتے ہیں۔ اس حلقہ کا ایک بدمعاش اور غنڈہ جو امیدواری کی تمام قانونی شرائط پوری کرتا ہے، بطور امیدوار کھڑا ہو جاتا ہے۔ انتخاب کے وقت کوئی دھاندلی نہیں ہوتی۔ یعنی ووٹنگ، قاعدے اور قانون کے مطابق صحیح صحیح ہوتی ہے اور وہ امیدوار کثرتِ رائے سے کامیاب قرار پا جاتا ہے۔ نظامِ جمہوریت کی رو سے نہ اس کے انتخاب کو ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے، نہ اس کی رکنیت کو مسترد۔ وہ اس حلقۂ نیابت کا جائز نمائندہ متصور ہوگا۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں اگر اکثریت اسی قسم کے نمائندوں کی ہو تو انہیں اپنی حکومت قائم کرنے کا جائز حق حاصل ہوگا۔ اسے اس مملکت کی آئینی حکومت تسلیم کیا جائے گا جسے آئینی طور پر کوئی برطرف نہیں کر سکے گا۔ ان کی پارلیمان کے وضع اور منظور کردہ قوانین، جو آئینِ مملکت کی قانونی شرائط پوری کریں، مملکت کے جائز قوانین قرار پائیں گے جنہیں ملک کی بڑی سے بڑی عدالت بھی چیلنج نہیں کر سکے گی۔

یہ ہے ملخص اس نظامِ جمہوریت کا جو اس وقت ساری دنیا کے آئینی ممالک میں رائج ہے اور جسے انسانی تدبرِ سیاست کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ نظام جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش   ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

(ضربِ کلیم)

اور بندوں کو نہ تولنے کے نتیجہ کے متعلق انہوں نے اس سے بھی بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ: ؏

کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اس قسم کے طرزِ حکومت کے تابع جس قسم کی آزادی نصیب ہوگی، ظاہر ہے۔ محض عددی (گنتی کی) اکثریت کے فیصلوں کے متعلق قرآن کریم نے واضح انداز میں کہہ دیا تھا کہ: وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (۶/۱۱۷) اگر تم محض اکثریت کو معیارِ اطاعت قرار دے لوگے تو صحیح راستے سے بھٹک جاؤ گے۔

قرآن کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ ایک فرد کو، اور نہ افراد کی کسی جماعت کو ــــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ۔ (۳/۷۸)۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے ضابطہ قوانین اور اقتدار امور حتیٰ کہ نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم و فرمان بردار بن جاؤ۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ (۱۲/۴۰) اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ مملکت قائم نہیں کرتے، تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (۵/۴۵) یہ لوگ ظالم ہیں۔ انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؛ لہٰذا، قرآن کی رو سے مملکت، قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور یہ فریضہ اُمت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے کہ: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) خدا کا ارشاد ہے۔ اس تصور کی رو سے، ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں، اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو، لیکن کاروبارِ مملکت، خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پا رہا ہو، تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے۔ اسے ملوکیت کہا جائے گا۔ لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہو اور امورِ مملکت اُمت کے باہمی مشورے سے طے پائیں، تو یہ آزادی ہے۔ خواہ طرزِ حکومت ــــــ (FORM OF GOVERNMENT) ــــــ کسی قسم کا ہو۔ اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصوراتِ حکومت، (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو آجکل کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظامِ جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابق اسلام، تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اگر حدود اللہ کے تابع نہیں تو دونوں غیر اسلامی ہیں۔ اسلامی نظامِ جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔

صدیوں کی ملوکیت کے خواب آور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا تھا۔ دوسری طرف

یورپ نے نظامِ جمہوریت کے حق میں اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ، جنت سے نکلے ہوئے آدم نے پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہے۔ وہ اس نظام کو آیۂ رحمت اور نوعِ انسانی کے لئے سحابِ کرم خیال کرتی تھی ——— ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان، بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اٹھنی شروع ہو گئیں کہ نظامِ جمہوریت عین مطابقِ اسلام ہے۔ اس ہنگامۂ ہائے و ہو، اور تلاطمِ شور و شغب میں، جبکہ ساری فضا اسی قسم کے نعروں سے گونج رہی تھی، اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد، جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس نے کہا کہ یاد رکھو! نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملوکیت ہے۔ اس کے برعکس، جس نظام کی بنیاد، ضابطۂ قوانینِ خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، ملوکیت ہے اور ظلم و استبداد کا مظہر! ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ کی آخری کتاب، ارمغانِ حجاز، میں (جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ——— ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ——— میرے نزدیک وہ عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمت پر شدید ترین تنقید ہے اور فکرِ اقبالؒ کا نچوڑ ..... اس کے ساتھ ہی، اسلام کے ایک زندہ و متحرک نظامِ حیات بننے کے خلاف جو قوتیں نہایت غیر محسوس طور پر مصروفِ تگ و تاز ہیں، اس میں ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی بڑے شوخ اور حسین انداز سے کی گئی ہے۔ نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی کابینہ (CABINET) کا اجلاس ہو رہا ہے جس کی صدارت خود ابلیس کر رہا ہے۔ اس کابینہ میں ان تمام عوامل کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جا رہا ہے جو ابلیسی نظام کے ضعف کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ عوامل زیرِ بحث آتے ہیں اور متعلقہ مشیر (وزیر) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اس کی مدافعت کے لئے کیا حربہ تجویز کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کی نمود اس حقیقت کی غماز ہے کہ انسان اس نظامِ ملوکیت سے تنگ آ چکا ہے جسے ابلیس نے مدت ہوئی وضع کیا تھا۔ اگر انسان نے اس نظامِ نو کو اختیار کر لیا تو پھر ابلیسی نظام کو زوال آ جائے گا۔ چنانچہ اس مشیر نے وزیرِ سیاست سے دریافت کیا کہ: ؎

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر!
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

وزیرِ امور سیاسیہ مسکرایا۔ اور کہا کہ "ہوں!" یعنی میں ان سب تازہ فتنوں سے باخبر ہوں۔ ؎

ہوں! مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے — جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر؟
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

بات یہ ہے کہ: ؎

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام — چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

یہاں اقبالؒ نے کہا ہے کہ ——— ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر ——— بالِ جبریل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ——— گدائی ——— وہ اس میں کہتے ہیں۔ ؎

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا!
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟ — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا!
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ ہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج!
کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا!

بالِ جبریل میں ایک غزل کا مطلع اسی اسلوب کا ہے جس میں کہا ہے: ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے!

لفظ سکندر سے ذہن کا رُخ، ضربِ کلیم کی اس برجستہ نظم کی طرف منتقل ہو گیا جس میں ایک بحری قزاق اور سکندر کا مکالمہ سامنے لایا گیا ہے۔ شاہنشاہ سکندر، قزاق سے کہتا ہے کہ: ؎

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری — کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق نے جواب دیا: ؎

سکندر! حیف تو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے — گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی!
تیرا پیشہ ہے سفاکی، میرا پیشہ ہے سفاکی — کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی!

اقبالؒ نے ملوکیت کے خلاف اسی انداز میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھی نمایاں کر کے سامنے لاتے ہیں کہ ——— زمانہ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں ——— فرق صرف یہ ہے کہ دورِ جہالت کی شخصی ملوکیت جو کچھ کرتی تھی کھلے بندوں کرتی تھی۔ لیکن عصرِ حاضر کی "جمہوری ملوکیت" وہی کچھ تہذیب کی اوٹ میں اور مفادِ عامہ کے تحفظ کے نقاب میں کرتی ہے۔ اُس زمانے کی سلب و نہب (EXPLOITATION) کو بادشاہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اِس زمانے کی "ملوکیت" اس سلب و نہب کو (PUBLIC INTEREST) کہہ کر عوام کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ جمہوریت

جس کا ——— چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ——— ہے۔

یہ تھا وہ جواب، جو ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں، وزیرِ امورِ سیاسیہ کی طرف سے دیا گیا۔ ابلیس کا یہ حربہ کس قدر کارگر ہے، اس کی تشریح اقبالؒ نے، بالِ جبریل کی ایک نظم میں کی ہے جس کا عنوان ہے ——— "ابلیس کی عرض داشت" ——— ابلیس خدا کے حضور ایک درخواست لے کر پہنچتا ہے جس میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس دور میں، کار پردازانِ نظامِ مملکت، ان فرائض کو جو ابلیس کے سپرد کئے گئے تھے، کس حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب اُس کی (ابلیس کی) اس کرۂ ارض پر ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے کہیں اور "ٹرانسفر" کر دیا جائے۔ وہ بحضور ربّ العزت عرض کرتا ہے کہ:ے

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!

میرے یہاں سے چلے جانے سے، اہرمنی سیاست کے کاروبار میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اور زیادہ چمک اُٹھے گا۔ اس لئے کہ:ے

تیری حریف ہے یا ربّ سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے! — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

پھر میری تو کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص میرا نام سننے پر (زبان ہی سے سہی) لاحول پڑھتا ہے لیکن ے

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

یوں اقبالؒ نے دورِ حاضر کی اس ملوکیت (یعنی مغربی نظامِ جمہوریت) کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

مذہبی پیشوائیت

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھیئے:-

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے۔ دنیا میں کوئی انسان کبھی کسی دوسرے انسان کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔ اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف ابا کرتی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم، ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضامند ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا؟ یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ ——— صید خود صیاد را گوید بگیر! ———

برہمن عوام کو یہ کہہ کر افیون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔ کلیسا کا اسقف، سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں۔ محراب و منبر سے یہ سحر آفریں الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ ——— السُّلطانُ ظِلُّ اللّٰہِ علی الارض ——— بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے۔ جو اس سے سرتابی کرتا ہے، وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے وعظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اس سے

دور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت، ثروت و حشمت، زیب و زینت، فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ انہیں اس پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اور آخرت کے حصول کے لئے وہ چند بے روح عقائد اور بے جان رسومات کو عین دین قرار دے کر، لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے تاکہ ان کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت، عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے تاکہ ملوکیت کو اپنی سلب و نہب میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ساجھا ہو جاتا ہے۔ راجہ، برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن، راجہ کو اشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ کنگ، کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے اور کلیسا بادشاہ کے حقوقِ خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان، مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا برسرِ منبر اس کے لئے تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ ہے ملوکیت اور برہمنیت کی وہ مل بھگت جس سے استبداد کے فولادی پنجہ کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھیئے! ہامان کی مدد کے بغیر، کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت کی دوبارہ نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی جلوہ دہ محراب و منبر ہو گئی۔ اقبالؒ نے قوم کو اس مہیب خطرہ سے بھی آگاہ کیا۔ اور عمر بھر، سلطانی کے ساتھ، ملائی و پیری کے خلاف بھی مصروفِ جہاد رہا۔

قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت کے فتنہ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ: اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۴) یاد رکھو! یہ علماء اور مشائخ، عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہیں خدا کا راستہ دکھاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی روک خود یہی لوگ ہیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے پر چلنے ہی نہ پائیں جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ: ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ!

خدا اپنے رسولوں کی وساطت سے جو دین بھیجتا تھا وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہوتا تھا جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی ہر نظام کو مٹا کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی متشکل کر دیا جائے۔ دین کے بنیادی تصورات اور ارکان و مناسک سب اسی انقلابی پروگرام کے اجزا ہوتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک یہ ہوتی تھی کہ دین کے ان تصورات کے الفاظ اسی طرح باقی رکھے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے۔ اس کے ارکان و مناسک کی ظاہری شکل و صورت وہی رہے لیکن وہ چند بے مقصد رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جائیں۔ یوں "مذہبی پیشوائیت" کا وضع کردہ مذہب، دینِ خداوندی کی ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا تھا جس کے خط و خال تو وہی رہیں لیکن جس کی حقیقت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا کہ: ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ:۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کیا تھا کہ: جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا۔ یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ۔ (۲۸/۴) وہ قوم میں افتراق پیدا کرتا رہتا۔ انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا۔ کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھا دیتا اور دوسری کو نیچے گرا دیتا۔ اور اسطرح انہیں کمزور کرتا رہتا کہ وہ اس کے خلاف اٹھنے نہ پائیں۔ ——— قرآنِ کریم نے اُمّت میں تفرقہ کو خدا کا عذاب قرار دیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ:——
وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا۔ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲)۔ مسلمانو: دیکھنا، تم ایک خدا پر ایمان لا کر کہیں پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی تم فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پہ سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پر۔ اس طرح اُمّت میں مسلسل پھوٹ پڑی رہتی ہے۔ ملوکیت کا اس میں فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے کراتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اُمّت کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہتے اور اس طرح انہیں باہم لڑاتے رہتے ہیں، اور ملوکیت اطمینان سے اپنی مفاد پرستیوں میں مصروف رہتی ہے۔ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے اسی حقیقت کو واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

دینِ حق از کافری رسوا تر است — زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب؟ — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

بالِ جبریل میں انہوں نے اسی حقیقت کو ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قیامت میں۔۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی! میری تقصیر معاف — خوش نہ آئینگے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

دین کے پروگرام کا ماحصل یہ تھا کہ جماعتِ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں قرآن میں عطا کردہ مستقل اقدار

کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ جلیل کے حصول کے لئے علومِ سائنس پر پوری پوری دسترس کے علاوہ، عالمگیر انسانیت کے مقتضیات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی گہری نگاہ ہونی ..... چاہیئے۔ لیکن جو کچھ ہماری مذہبی درسگاہوں میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے اس سے تو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ سوئی کیسے بنائی جاتی ہے اور یونائیٹڈ نیشنز کس بلا کا نام ہے۔ ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل "علماء کرام" کو زندگی کے عملی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے!
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اتنا ہی نہیں ——— ان کے نصاب میں اٹھارہ اٹھارہ علوم تو ہوتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جو علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے، ان کے ذہنوں میں فرسودہ یونانی علم الکلام اور پامال شدہ عجمی تصوّرات اس طرح ٹھونس دیئے جاتے ہیں کہ ان میں دین کے مبادیات تک کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اسی کا رونا روتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے — طریقِ شیخِ فقیہا نہ ہو تو کیا کہیئے

طریقت

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اصحابِ طریقت ان سے بھی گئے گزرے ہیں ——— بالِ جبریل میں ہے:۔

رمز و ایما اس زمانے کیلئے موزوں نہیں — اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کن!

دین کا انقلابی پروگرام یکسر مجاہدانہ زندگی کا متقاضی تھا جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ تصوف زندگی سے فرار سکھاتا ہے اس لئے خدا کے دین سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے ——— اقبالؒ کے الفاظ میں ——— "تصوّف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" ——— دین، قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ تصوف رگِ حیات میں رواں دواں خون کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دین، وہ شعلۂ جوالہ ہے جو باطل کے ہر نظام کو خس و خاشاک کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ تصوف زندگی کی رہی سہی حرارت کو بھی افسردہ کر کے قوموں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہی وہ تاسف انگیز منظر تھا جسے دیکھ کر اقبالؒ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تھا کہ:۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اس نے اربابِ خانقاہیت کو پکار کر کہا کہ:۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

اقبالؒ سے بھی پہلے، ایک اور قرآنی نگاہ رکھنے والے مردِ مومن ــــ سر سید علیہ الرحمۃ ــــ نے ان اجارہ دارانِ روحانیت کے متعلق کہا تھا کہ:-

مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے۔ اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں سادہ لوحی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے یہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی، محنت کے بغیر درہم و دینار دلاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہربات پر آمنّا وصدّقنا کہتے کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی ہربات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔

ان بظاہر "حجرہ نشینوں" کی یہ کیفیت ہے کہ لوگوں کو یہ دنیاوی آسائشوں اور زیبائشوں سے نفرت دلاتے رہتے ہیں لیکن خود ان کے محلات ہر قسم کی عیش سامانیوں کے مراکز ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے (بالِ جبریل میں) ایک "باغی مرید" کی زبان سے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے جب کہا ہے کہ:-

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی! گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ تھا ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا وہ دجل و فریب جس کے احساس سے اقبالؒ نے خون کے آنسو روتے ہوئے بحضور رب العزت فریاد کی تھی کہ:-

خدا وندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری

نظامِ سرمایہ داری

اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسنے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی مؤثر ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال دھوآں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ سرکس کا شیر، اپنی مہیب قوتوں کے باوجود، رنگ ماسٹر (RING MASTER) کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ بھوک، وہ مؤثر ترین حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں اس حربہ کا نام نظامِ سرمایہ داری ہے جو حکمتِ ابلیسی کا نادر شاہکار ہے۔ اس میں عیار طبقہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر

بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے، لیتا ہے۔ دینِ خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت، فاضلہ دولت (یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے) کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا، اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ـــ جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں، اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام نہیں کرتے، اے رسول! تو ان سے کہدے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ۔ جس دن اس دولت کے سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ: هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ـــ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا، اب اس دولت کا مزہ چکھو۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ فاضلہ دولت زمانہ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی۔ اور عصرِ حاضر میں نظامِ کارخانہ داری (انڈسٹری) کی رُو سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نظامِ زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ۔ (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ اس لئے اسے سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ۔ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشتکار کی صرف محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار، فطرت کی ان بخششوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتھیا لیتا ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشیں انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ۔ کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارا کس قدر۔ تم زمین میں ہل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد ـــ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ۔ کیا اس دانے کو تم اگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے....؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ـــ اگر ہمارا قانونِ مشیت ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف، تمہارا بیج بھی ضائع ہو جاتا اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ۔ پھر تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا دار و مدار ہے۔ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ اگر ہمارا

قانونِ مشیت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برستا۔ تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ۔ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سربستہ ہے۔ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ۔ کیا درختوں کی سبز شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ کر چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے۔ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً۔ ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کرا دی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے۔ اس لئے اس کے ماحصل میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو۔ تم پوچھو گے کہ ہمارا حصہ ہم کیسے دیں؟ سو سن لو کہ وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ۔ (۵۶/۷۳) اسے بھوکوں کو دے دو۔ یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔

اقبالؒ نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ: ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں
(بالِ جبریل)

پھر اس نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پستے ہوئے خاک نشیں مزدور کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ: ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبالؒ نے "بندۂ مزدور" کو یہ پیغام ۲۳-۱۹۲۲ء میں دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اسی پیغام کو اور بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں دہرایا۔ بالِ جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے ——— فرشتوں کا گیت اس میں ملائکہ، خدا سے شکوہ سنج ہیں کہ: ؎

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی!
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اس پر خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ: ؎

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

"فرشتے" وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے "زمانے کے تقاضوں" کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وہ "زمانے کے تقاضے" تھے جنہیں دیکھ کر، اقبالؒ کی نگہِ دوررس نے بہت عرصہ پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اب ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

انہوں نے حکیم سنائی کے ایک مصرعہ کو موضوعِ سخن قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ :-

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے — "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا"

یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے، جب ہنوز (شاید) خود چینیوں کو بھی اپنے مستقبل کا حتمی طور پر اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ قرآن پر غور و فکر انسان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔

قرآن کریم نے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اقبالؒ نے کہا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"شاید" اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ روس نے جس اشتراکی نظام کی اساس پر عظیم عمارت استوار کرنے کا دعویٰ کیا ہے، اس کے ہاں ایسی

بنیاد کوئی نہیں جو اس عمارت کا بوجھ اُٹھا سکے۔ اُس نے اہل روس سے اُسی زمانے میں کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستہ اُورا اساسِ محکمے ؟

یہ بنیاد قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔ اس لئے ؎

داستانِ کہنہ شستی یاب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے، روس میں اشتراکیت کس بُری طرح سے ناکام ہو رہی ہے۔ یہ معاشی نظام، قرآن ہی کی بنیادوں پر کامیابی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے آخری بند میں نہایت اُجلے، نکھرے اور حسین و شاداب انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سُنیئے :-

ابلیس کی کابینہ کے مشیرِ اقتصادیات نے کہا کہ دنیا میں اشتراکیت کا چرچا عام ہو رہا ہے اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ ہمارا وضع کردہ نظامِ سرمایہ داری کہیں پامال نہ ہو جائے۔ اس لئے ہمیں اس کے سدباب کی کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ ابلیس نے یہ سُن کر کہا کہ تم نے صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ ہمیں اشتراکیت سے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہمارے لئے خطرہ کا گوشہ .... اور ہے جس کی طرف تم میں سے کسی کی بھی نگاہ نہیں گئی ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس پر اس کے مشیروں کی آنکھوں میں خفیف سی ہنسی پھیر گئی جو اس تنقید کی غماز تھی کہ موجودہ مسلمان قوم سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے ؛ اس پر ابلیس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآن نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عہدِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں !

کون سی شرعِ پیغمبر .... ؟

الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ راہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

یہ ہے ہمارے لئے حقیقی خطرہ کا موجب ——— اس لئے ؎

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اب ابلیس کے مشیروں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے لئے حقیقی خطرہ کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ابلیس سے پوچھا کہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ کرنا کیا چاہیئے ؟ ——— وہی جو ہم کرتے چلے آئے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے نظام کی آلۂ کار، مذہبی پیشوائیت کو تھپکتھپاؤ، اور اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافی اور نظری مسائل میں اُلجھائے رکھے کہ :- ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا محمدؐ جس میں ہوں، فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　　امت مرحوم کی ہے کس عقیدت میں نجات

ذرا سوچو ـــــ کہ :

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں　　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

ایسے ان نظری مسائل کی الجھاؤ میں ڈالے رکھو۔ اور اس طرح

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے!　　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر　　　جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

لہٰذا، تم انتہائی جد و جہد سے

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے　　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا کام نہیں ـــ یہ ہو گیا تو تم چین کی نیند سوؤ۔ اس سے یہ قوم، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں بدستور جکڑی رہے گی اور ہمارا پورا لاؤ لشکر فسادِ آدمیت کے پروگرام کی تکمیل میں آزادانہ مصروف رہے گا۔

پاکستان

اقبالؒ نے ابلیس کی اسی سازش کو ناکام بنانے کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ پاکستان سے اس کی مراد تھی ایک ایسا خطۂ زمین جس میں قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہو تاکہ اسلام پر جو ملوکیت کا ٹھپہ لگ چکا ہے وہ دور ہو جائے مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو اور سرمایہ داری کی جگہ صحیح قرآنی نظامِ معیشت رائج کیا جا سکے۔ اس سے "اشتراکیت" کو وہ اساس محکم میسر آ جائے گی جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۴۷ء میں وہ خطۂ زمین ہمیں مل گیا۔ لیکن اُس وقت وہ حکیم الامت یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو ہمیں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی اس نشست کی روئیداد بھی اپنے الفاظ میں سناتا جو حصولِ پاکستان کے وقت، ہنگامی طور پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہوتی کہ جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو ابلیس کے مشیر چیختے چلاتے اس کے پاس آئے اور کہا کہ جہاں پناہ! غضب ہو گیا۔ تحریکِ پاکستان کامیاب ہو گئی۔ مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت قائم کرنے کیلئے جداگانہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس تحریک کے قائد نے بہت پہلے اعلان کیا تھا کہ اسلامی مملکت، جس کے قیام کے لئے ہم جد و جہد کر رہے ہیں، قرآنی احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی ہو گی۔ اس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو وارننگ دے دی تھی کہ تمہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہو گی کیونکہ وہاں نظامِ سرمایہ داری نہیں چل سکے گا۔ اس نے ابھی ابھی (۱۹۴۷ء میں) ایک براڈکاسٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہو گی۔ ہم نے دس برس تک مذہبی پیشوائیت کو برابر آگے بڑھائے رکھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرے اور "خدا و رسول" کے نام پر عوام کو اس کی حمایت کرنے سے باز رکھے۔ لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی اور وہ تحریک کامیاب ہو گئی۔

اب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم ہو جائیگا اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی ـ باطل پناہ! یہ کیا ہو گیا؟ ـــ یہ کیسا انقلاب آ گیا؟

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر　　　جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج!　　　کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے　　　جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا۔ اور اس کے بعد نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ انقلاب ہمارے لئے ایک بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے لیکن اس سے اس طرح گھبرانے اور چیخ و پکار کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مسلمان، مذہب پرست قوم ہے۔ اسے اسی راستے سے بہکایا جا سکتا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں بے نقاب ہو کر سامنے آئیں تو مسلمان اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہی قوتیں جبّہ ہب کا لبادہ اوڑھ کر آئیں تو یہ سادہ لوح نہایت آسانی سے ان کے دامِ فریب میں آجاتا ہے۔ لہٰذا تم اپنی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کرو۔ ان کا جال سارے ملک میں بچھا دو۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ۔ اپنے پراپیگنڈے کی شیرینی کو تیز تر کر دو۔ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ اپنے لاؤ لشکر کو ان کے (DISPOSAL) پر چھوڑ دو کہ یہ چاروں طرف سے اس امت پر یورش کریں۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرو۔ اور ایسا انتظام کرو کہ قوم کا نوجوان طبقہ ان کی گرفت میں رہے۔ وَعِدْهُمْ۔ (۱۷/۶۴) اور انہیں حکومت و اقتدار کے سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے پیچھے لگاتے رہو۔ تم یہ کچھ کرو اور پھر دیکھو کہ اس خطۂ زمین میں بھی تمہاری حکمرانی کس طرح بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ میرے مدتوں کے آزمائے ہوئے تیر ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ انہی حربوں سے ہم نے مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی مملکتوں کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ وہاں مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں! ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

تم دیکھتے نہیں کہ:

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں:

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا! کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

ان حربوں نے جو کچھ ان ممالک میں کیا ہے، وہی کچھ اس نوزائیدہ مملکت میں بھی کیا جا سکتا ہے جب تک دنیا میں مذہبی پیشوائیت باقی ہے ہمارے لئے خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ ابھی تک منتشر ہیں۔ تم ان کی ایک منظم جماعت بناؤ۔ ان کی طرف زر و سیم سیلاب کی طرح انڈیل دو۔ سرمایہ پرست سلطنتوں کو ان کا پشت پناہ بناؤ۔ اس طرح تم انہیں ہر طرح سے تقویت پہنچاتے رہو اور جو پروگرام میں نے پہلے تجویز کیا تھا اس پر اور بھی زیادہ شدت سے عمل پیرا ہو جاؤ۔ نئی نسل کے نوجوانوں کو دین کی طرف سے متنفر کرتے جاؤ۔ اور پرانی نسل کو:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس پروگرام کے مطابق، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہبی پیشوائیت جو مسلسل دس سال تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتی چلی آ رہی تھی، پاکستان میں آن موجود ہوئی۔ اقبالؒ اس سے بہت پہلے دنیا سے جا چکا تھا، اور جناحؒ، قیامِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کو یہاں پوری طرح کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ:

چونکہ پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصولِ پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے...... اور چونکہ یہاں مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں۔ لہٰذا، انہیں چاہیئے کہ وہ مسندِ قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں۔

اُس زمانے سے اب تک یہاں یہی جنگ جاری ہے جس نے قوم کو ان مقاصد کے حصول کی طرف آنے ہی نہیں دیا جن کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ حسبِ معمول اس جنگ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہے کیونکہ مذہبی پیشوائیت ان کے مفا

کی پوری پوری نگہداشت کرتی ہے۔ مثلاً یہاں جب یہ تجویز سامنے آئی کہ اللہ کی زمین، جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضہ سے نکال کر کاشتکاروں کو دے دی جائے۔ اور اس نہج کا قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی شخص کے قبضہ میں اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہنے پائے گی تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ فتویٰ صادر فرما دیا گیا کہ ایسا کرنا خلافِ شریعت ہے۔ زمین ہی نہیں۔ دولت سمیٹنے پر بھی کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی اس لئے کہ:۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی .... روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت پر کوئی حد نہیں ..... وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اپنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۵۲، صفحہ ۷۲۔ ایڈیشن ۱۹۵۰ء)

نتیجہ اس کا یہ کہ دولت چند مراکز میں سمٹ کر آ گئی اور غریب طبقہ دن بدن روٹی تک کا بھی محتاج ہوتا چلا گیا۔ مذہبی پیشوائیت خوش ہے کہ ان کا جہادِ عظیم کامیاب ہو رہا ہے اور سرمایہ دار مطمئن کہ اسلام کی ڈھال ان کے لئے تیار کر دی گئی ہے جس کے پیچھے وہ جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔

لیکن اس میں، عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب ابلیس اپنے مشیروں کو یہ پروگرام دے رہا تھا تو آنسوئے افلاک سے یہ نشیدِ جلال بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو ——— اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (۱۷/۶۴) ——— میرے بندوں پر تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا ——— وہ بندے کہ۔ ع

جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

وہ شمعِ قرآن کو لے کر اٹھیں گے اور تمہارے مکر و دجل کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کے پردے چاک کر سکے، ان کے پیچھے چھپے ہوئے ایک ایک چہرے کو بے نقاب کرتے جائیں گے ——— یہ کشمکش نئی نہیں:۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز!
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ جہاں اور جب بھی، "چراغِ مصطفویؐ" کے علمبرداروں نے استقامت سے کام لے کر اپنی جدوجہد جاری رکھی، "شرارِ بولہبی" خاکستر ہو کر رہ گیا۔ اور فرعون، ہامان

ط کوئی سند نہیں، کوئی حوالہ نہیں۔ فقط ان کا ایسا کہہ دینا "اسلام" ہے!

اور قارون" کا متحدہ محاذ بھی اسے بچھنے سے بچا نہ سکا ـــــ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا - (۶/۴۵) اس طرح ہر ظلم کرنے والی جماعت کی جڑ کٹ گئی ـــــ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ - (۴۰/۷۸) اور قرآنی نظام کی مخالفت کرنے والی ہر قوت، خاسر و نامراد رہ گئی ـــــ یہی پہلے ہوا ہے۔ یہی اب ہوگا۔ ؎

حقیقت سے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

اور یہ اس دن ہوگا جب مسلمانوں میں خدا کے عطا کردہ دین اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب میں فرق کرنے والی نگاہ پیدا ہو گئی۔ اور اس قسم کی نگاہ، قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لہٰذا، عزیزانِ من! ہمارے لئے اقبالؒ کا پیغام یہ ہے ـــــ اور یہ پیغام اقبالؒ کا نہیں، درحقیقت قرآن کا پیغام ہے ـــــ کہ اس خطۂ زمین، ارضِ پاکستان، کی حفاظت کا پورا پورا سامان کیا جائے ـــــ کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی (خدانخواستہ) باقی نہ رہا تو قرآنی نظام نافذ کس جگہ ہو سکے گا ـــــ اور جو تخریبی قوتیں، اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرتی ہیں، ان کے فریب میں نہ آیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی ملک میں قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ جب یہ پیغام فضا میں عام ہو گیا تو تخریبی قوتیں اس طرح کافور ہو جائیں گی جس طرح طلوعِ سحر سے رات کی تاریکی کفن پوش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو یقین جانیئے کہ: ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار!
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جادۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

سود اور مضاربت

سود ایک ایسا امرِ شنیع ہے جس کی حرمت پر امتِ مسلمہ کے تمام فرقوں کا مکمل اتفاق ہے۔ اس مکمل اتفاق کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں قرآنِ حکیم میں اس کی حرمت کا اعلان فرما دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ - فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ (۲/۲۷۸-۲۷۹)

اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود تمہارا لوگوں پر باقی ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

قرآنِ حکیم میں سود کی حرمت کے لئے جو سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ کسی دوسرے جرم، یہاں تک کہ قتل کے لئے بھی استعمال نہیں ہوئے۔ اس سے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہمارے سلفِ صالحین سود تو کجا جس چیز میں سود کا معمولی سا شک بھی ہوتا تھا اس سے ہر ممکن طریقے سے بچتے تھے اور اس کے لئے حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کو بطور سند پیش کرتے تھے:-

إن آخر ما نزل من القرآن آية الربا - وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربوا والريبة۔

(کنز العمال۔ مطبوعہ حیدرآباد۔ دکن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۳۱)

آیتِ سود قرآنِ مجید کی آخری نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ حضور صلعم کا وصال ہو گیا اور آپ نے ہمارے سامنے اس کی مفصل تفسیر نہیں فرمائی اس لئے تم سود اور جس معاملے میں سود کا شبہ ہو، ترک کر دو۔[۱]

سود کی شرعی تعریف

قرآنِ مجید میں سود کے لئے ربٰوا یا ربا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے لغوی معنی زیادتی، نمو، بڑھوتری اور چڑھنے کے ہیں۔ شرعی

---

[۱] ہمیں اس روایت کی صحت میں شبہ ہے کہ ربٰو جیسے سنگین ترین اور اس زمانے کے معاشرہ میں عام جرم کی تشریح نہ رسول اللہؐ نے بیان فرمائی، نہ صحابہ کبارؓ نے دریافت فرمایا۔ ایسا اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ خود قرآنِ مجید میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

اصطلاح میں اس کی سب سے جامع مگر مختصر تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

الربا فی اللغة هو الزيادة والمراد به فی الآية كل زيادة لم يقابلها عوض۔ [1]

لغت میں ربا کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور آیت میں اس سے مراد وہ بڑھوتری ہے جس کے مقابلے میں کوئی بدل نہ ہو۔

سود کی اس تعریف کی رو سے ہمارے بہت سے معاملات سودی کاروبار قرار پاتے ہیں۔ ان بعض معاملات کے بارے میں خود حضور صلعم نے بھی واضح طور پر اشارے فرمائے ہیں۔ لیکن صدیوں تک سرمایہ داری نظام کی چکی میں پسنے کی وجہ سے ہمارا اس طرف خیال بھی نہیں جاتا۔ اور ہم صرف بینک کے سود کو ہی سود سمجھتے ہیں۔ اس وقت چونکہ ہمارے سامنے اس سلسلے کی ایک اہم اصطلاح مضاربت کی تشریح و توضیح ہے۔ اس لئے کسی دوسری فرصت میں ایسے معاملات کی تفصیلات قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو اصل موضوع تک محدود رکھیں گے۔

صدر ایوب (مرحوم) کے زمانے میں سود کی مختلف اقسام کی شرعی حیثیت کے بارے میں ایک عمدہ بحث کا آغاز ہوا تھا، اور اس موضوع پر مختلف افکار سامنے آرہے تھے اور یقین ہو چلا تھا کہ یہ علمی بحث کسی مفید نتیجے پر ختم ہوگی، لیکن اسی دوران میں ان کا دور حکومت ختم ہو گیا اور بعد میں اس قسم کی علمی بحثوں کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اب ایک دفعہ پھر اس موضوع کی اہمیت نے سر ابھارا ہے تو ارباب علم نے اس مفید بحث کو دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مختلف اخبارات میں کافی علمی مضامین آچکے ہیں۔ یہ مضامین اگر علمی رسائل میں شائع ہوتے تو زیادہ مفید نتائج کے حامل ہوتے کیونکہ بوقت ضرورت روزنامہ جات کے حوالجات دستیاب نہیں ہو سکتے اور اس طرح یہ علمی بحثیں تشنہ سی رہ جاتی ہیں۔ ان اخباری مضامین کو ایک نظر دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھنے والے اہل علم جدید معاشیات کا تو گہرا علم رکھتے ہیں لیکن جہاں تک علوم اسلامی کا تعلق ہے (بالعموم) ان کی نظر اتنی گہری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سود کی بحث واضح ہونے کے بجائے الجھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس سلسلے کی ایک اہم بنیادی اصطلاح "مضاربت" کہ جس کی بنیاد پر موجودہ بنکاری نظام کو اسلامی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، کی بعض اوقات بالکل غلط تشریح کی جاتی ہے۔ اکثر اہل علم نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ بینک نفع و نقصان کی شرکت کے اصول پر کام کریں گے۔ یعنی کھاتہ داروں کو بینک کے نفع و نقصان میں شریک کر لیا جائے گا۔ وغیرہ

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے خالص علمی بحثوں کے لئے اخبارات کے حوالجات زیادہ وزن نہیں رکھتے۔ اس لئے میں نے کوشش کی کہ اگر مذکورۃ الصدر ماہرین معاشیات کی کوئی قابل حوالہ تحریر مل جائے تو وہ اس علمی بحث کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ خوش قسمتی سے مجھے ان میں سے ایک بڑے

---

[1] احکام القرآن تالیف ابن العربی مطبوعہ مصر۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۴۲۔

ماہر معاشیات کی کتاب "اسلام اور سود"[1] مل گئی جو اس موضوع پر ایک مفصل کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف کا شمار ہمارے ملک کے چوٹی کے ماہرین معاشیات میں ہوتا ہے۔ وہ کافی عرصہ تک حکومت پاکستان کے مالی مشیر اور اپنی اسلامی تحقیقات کی وجہ سے سعودی عرب کی حکومت کے بھی مالی مشیر رہے ہیں۔

مضاربت کے اصول پر بینکاری

فاضل مصنف موجودہ بینکاری نظام کو مضاربت کے اصول پر چلانے کے لئے بڑے تفصیلی دلائل دیتے ہیں۔

سب سے پہلے اپنی مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۹۱ پر فرماتے ہیں:-

اسلام نے منافع اور ایسی شراکت کو کہ جس میں نفع اور نقصان دونوں کی ذمہ داری ہر شریک پر ہو جائز قرار دیا جائے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:-

اسلام سود کی ممانعت کرتا ہے۔ لیکن منافع اور شراکت کو جائز قرار دیتا ہے۔ بینک اگر صنعتوں کو قرضہ دینے کی بجائے ان کے حصہ دار بن جائیں اور ان کے نفع و نقصان دونوں میں شریک رہیں تو پھر ایسے بینکوں کے خلاف اسلامی نظام میں کوئی اعتراض نہیں۔ (صفحہ ۱۵-۲۱۴)

پھر صفحہ ۲۶۶ پر اسی مضمون کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں:-

لیکن اگر روپیہ قرض دیا جائے اور نفع و نقصان کو باہمی طور پر تقسیم کرنے کا معاہدہ کر لیا جائے تو یہ مثال کاروباری شراکت کی ہے اور اسلام اس کی نمایاں ترغیب دیتا ہے۔

اور آخر میں اپنی ان تشریحات کے لئے مضاربت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں:-

یہی صحیح اسلامی سپرٹ ہے کہ جو کاروبار میں روپیہ لگائے اس کی نوعیت مضاربت کی ہو اور وہ نفع و نقصان دونوں میں برابر کا شریک ہو۔ (صفحہ ۳۱۰)

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ جس اصطلاح کے سہارے سود جیسے سنگین جرم کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کا غلط مفہوم پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی مضاربت میں نفع و نقصان میں شرکت بتائی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اس کی جو تشریح بیان کی گئی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ آپ اسلامی فقہ کی چھوٹی بڑی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں آپ کو مضاربت کی یہ تعریف ملے گی:-

هی فی اللغة عبارة عن ان یدفع شخص مالا لآخر لتجر فیه علی ان یکون الربح بینهما علی ما شرط والخسارة علی صاحب المال۔[2]

لغت میں مضاربت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کو سرمایہ اس شرط پر مہیا کرے کہ نفع تو ان

---

[1] مصنف ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ہانیہ پبلشنگ ہاؤس لاہور چھاؤنی۔

[2] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مطبوعہ مصر جلد دوم۔ صفحہ ۴۲۔

دونوں کے درمیان بمطابق شرط ہوگا لیکن نقصان صرف صاحب سرمایہ پر ہوگا۔

یعنی مضاربت کے کاروبار میں صاحب سرمایہ اور کام کرنے والا دونوں منافع میں تو برابر کے شریک ہوں گے لیکن، اگر خدانخواستہ اس کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑا تو وہ سب کا سب صاحب سرمایہ کے ذمہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کام کرنے والا حصہ دار صرف نفع میں شریک ہوگا۔ وہ نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اتنا ہی نہیں اس کے اخراجات بھی سرمایہ سے پورے کئے جائیں گے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:۔

ونفقة العامل من المال فی سفرہ من طعامہ وکسوتہ ومایصلحہ بالمعروف بقدر المال۔ ۱؎

کام کرنے والے حصہ دار کا سفر خرچ۔ مثلاً کھانا، کپڑے اور دوسرے اخراجات سرمایہ کی مقدار کے لحاظ سے سرمایہ ہی سے وصول کئے جائیں گے۔

یعنی ان اخراجات کے بعد اگر نفع ہوگا تو حصہ کے مطابق ان میں تقسیم ہوگا لیکن اگر اس کاروبار میں نقصان ہوگیا وہ کارندہ یعنی کام کرنے والے کے ذمہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ مضاربت کا مال اس کے پاس بطورِ امانت تصور کیا جاتا ہے۔

ثم المدفوع الی المضارب امانة فی یدہ۔ ۲؎

"یعنی جو سرمایہ کارندہ کے حوالے کیا جائے" وہ اس کے پاس بطورِ امانت ہوگا۔"

اور امانت کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر وہ کسی کے پاس ضائع ہوجائے تو وہ شرعاً اس کا ذمہ دار نہیں۔

الامانة فی ید المودع اذاھلکت لم یضمنھا۔ ۳؎

اگر امین کے پاس امانت کا مال ضائع ہوجائے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں۔

یہ تو ہے مختصر الفاظ میں مضاربت کی "شرعی" حیثیت۔ لیکن بعض ائمہ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک سرے سے مضاربت کی شرعی حیثیت ہی مشکوک ہے۔ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں:۔

قال ابن حزم فی مراتب الاجماع کل ابواب الفقه فیھا اصل من الکتاب والسنة حاشا القراض۔ فما وجدنا له اصلاً فیھا البتة۔ ۴؎

امام ابن حزم مراتب الاجماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کے ہر باب کی اصل کتاب وسنت میں مل جاتی ہے مگر مضاربت کی ایسی کوئی اصل کتاب وسنت میں نہیں ملتی۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے ائمہ فقہ بھی صرف مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دیتے ہیں جس سے اسے عام

۱؎ تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالکؒ۔ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر۔ ص ۸۸

۲؎ ہدایہ اخیرین۔ مطبوعہ دہلی۔ ص ۲۸۱۔ کتاب المضاربتہ۔

۳؎ ایضاً۔ ص ۲۰۱

۴؎ نیل الاوطار۔ از علامہ شوکانی۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ۵۔ ص ۲۸۲۔

اصول کے طور پر نہیں اپنایا جا سکتا۔ مشہور حنفی امام شمس الائمۃ سرخسیؒ اس کے جواز پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

إن بالناس حاجة الى عقد المضاربة وصاحب المال قد يكون عاجزا عن التصرف بنفسه۔[1]

لوگوں کو مضاربت کے معاملہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے کیونکہ بعض اوقات صاحبِ سرمایہ خود کاروبار کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔

یعنی حنفی فقہ میں بھی اس کی اجازت اس شرط سے مشروط ہے کہ صاحبِ سرمایہ خود کام کرنے کے قابل نہ ہو۔ وہ بھی اسے کاروبار کا عام اصول تسلیم نہیں کرتے۔

اس بحث سے جو کچھ سامنے آتا ہے اس کے مطابق فقہ کی رو سے بلاسود بینکاری کے لئے مضاربت کا استعمال صرف محدود پیمانے پر کیا جا سکتا ہے۔ عام کھاتہ داروں کو مضاربت کے اصول پر بینک کے کاروبار میں شریک کرنے کی بجائے ہمیں اسلام کے اخلاقِ فاضلہ کو اپنانا ہوگا۔ اس وقت ساری قوم بیک زبان نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہی ہے اور وہ سود کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان حالات میں کھاتہ داروں کو سود یا سودی منافع سے بچنے کی آسانی سے ترغیب دی جا سکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنی بچت کی حفاظت کے لئے اسے بینکوں میں بطور قرضِ حسنہ جمع کرائیں۔ اس سے ان کی رقم نقصان سے مامون ہو جائے گی۔ بے شک وہ اس معمولی منافع سے جو سال کے بعد ملتا ہے، محروم ہو جائیں گے لیکن سودی نظام کے خاتمے سے ساری قوم کو جو مجموعی فوائد حاصل ہوں گے وہ اس میں برابر کے شریک ہوں گے اور جو یقیناً سود کی معمولی شرح سے زیادہ ہوں گے۔ اس کی وضاحت ایک عملی مثال سے ہوگی۔ میں نے بعض کاروباری حضرات سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اکثر اجناس کے کاروبار میں کم از کم تین مراحل پر چودہ فی صد کے حساب سے سود شامل ہوتا ہے۔ مثلاً کپڑے کی تجارت ہی کو لیجئے۔ پہلے کپاس بینک سے قرض کے روپے سے خریدی جاتی ہے۔ پھر تیار کپڑے کو بڑی ایجنسی والا بینک کے قرض کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اور تیسرے درجے پر تھوک فروش بھی اسی عمل کو دہراتا ہے۔ پھر کہیں جا کر چوتھے مرحلے پر پرچون فروش کے پاس مال پہنچتا ہے۔ اگر سودی نظام ختم ہو جائے تو کپڑے کی قیمتوں میں فوری طور پر بیالیس فی صد کمی ہو سکتی ہے۔ اور جب ہر طرف سے سودی لین دین کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہ کمی اور بھی زیادہ ہوگی۔ چنانچہ مختلف اشیائے صرف کے نرخوں میں کمی سے عام کھاتہ داروں کو جو فائدہ حاصل ہوگا وہ ان کے بینک کے سود یا نفع کی نسبت سے زیادہ ہوگا۔ اور قوم ایک بہت بڑی برائی سے چھٹکارا پالے گی۔

طلوعِ اسلام

محترم شہاب صاحب نے اس موضوع پر حسبِ معمول، فقہ کی روشنی میں بحث کی ہے۔ یہ بحث نظری اور علمی حیثیت سے مفید ہو سکتی ہے اور ان لوگوں کے لئے

---

[1] مبسوط۔ از علامہ سرخسی۔ جلد ۲۳۔ ص۱۔

حجت جو معاشیات کا حل فقہ کی رو سے دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی بحثیں اصل مسئلہ کا حل پیش نہیں کر سکتیں۔ یہ کوشش اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کو قائم رکھتے ہوئے جو قرآنی نظامِ معیشت کی ضد ہے، اس کے برگ و بار کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کے فیصلے کئے جائیں۔ قرآنی نظامِ معیشت کے موضوع پر طلوعِ اسلام میں بڑی تفصیل اور تکرار سے لکھا جا چکا ہے، اس لئے اس مقام پر اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اشارات میں یوں سمجھئے کہ :-

۱۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد، فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کے موجود ہونے پر ہے۔ یعنی جب کسی کے پاس اس کی ضروریات سے زائد روپیہ ہوگا تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ اس روپے کو کیا کرے۔

۲۔ نظامِ سرمایہ داری کی رو سے وہ شخص اپنا روپیہ کسی دوسرے کو استعمال کے لئے دے دے اور اس سے اپنے اصل زر (راس المال) سے زیادہ کچھ لے لے۔ اس زائد رقم کو سود یا منافع کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے الربوٰ کہہ کر پکارتا ہے خواہ اس کی کوئی شکل بھی کیوں نہ ہو۔ مزارعت (زمین کا نقدی کرایہ یا بٹائی) مضاربت (کسی کے کاروبار میں سرمایہ لگا کر بطور (SLEEPING PARTNER) منافع حاصل کرنا)۔ وغیرہ ——— قرآنِ کریم کی نصوصِ صریحہ کی رو سے یہ حرام ہے اور اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت۔

قرآنی نظامِ معیشت میں :-

(ا) ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے۔

(ب) اسلامی مملکت اس کی اور اس کے لواحقین کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے۔ اسے اس کی محنت کا معاوضہ سمجھ لیجئے۔

(ج) اس طرح، کسی کے پاس نہ فاضلہ دولت رہتی ہے، نہ اس کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(د) اصولاً، معاوضہ محنت کا ہوتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربوٰ کہلاتا ہے۔ (اگر انفرادی تجارت کی صورت قائم رکھی جائے تو اس میں بھی تاجر اپنی محنت کا معاوضہ لے سکتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں)۔

اس سے واضح ہے کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری اور قرآنی نظامِ معیشت ایک دوسرے کی ضد ہیں ——— نظامِ سرمایہ داری کو قائم رکھتے ہوئے، اُسے پیوند سازی سے "اسلامی" بنانے کی کوششیں اگر ابلہ فریبی یا خدا فریبی نہیں تو خود فریبی ضرور ہیں۔ ان سے وقت۔ دولت۔ توانائی کے ضیاع کے علاوہ اسلام کے متعلق طرح طرح کے الجھاؤ اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

سرِدست ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قارئینِ کرام (۱) پرچہ کی ترسیل کے متعلق خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے ورنہ تعمیل نہیں ہوگی۔
(ناظم ادارہ)